ناول ''سمندر کا پانی'': تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر طاہر عباس طیب، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر محمد افضال بٹ، انچارج فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ
ڈاکٹر محمد خرم یاسین، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

ABSTRACT:

Fayyaz Zaffar is one of the leading novelists in modern fiction. His first novel "Samudar Ka Pani" has highlighted topics like politics, religion, nature and society. In the novel, along with the devastation of the nuclear attack on Hiroshima, the tragedy of East Pakistan and the country's political situation have been described. Among other problems of the society, social degradation including the curse of superstition and adultery is also presented. In this novel, the author presents his thoughts through modern style. The language of this novel is simple and easy. He has made social, political situations and social problems the subject in his novels. The story of novel seems to reflect our current society, role of martial relations in strengthening, blaming and evil deeds. Fayyaz Zafar has adopted a modern style in his novels. The themes of his novel seem to reflect the unrest in the society, the mood of the people constantly trying to change their circumstances and problem of the society. He has tried to tell that love is the foundation of the society. In the article these genres and topics have also been made a part of society.

Keywords: Novel, contemporary, economic & social problems, Current society, intricacies of relationship, various aspects, circumstances.

فیاض ظفر کا شمار اُردو کے جدید فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اسّی کی دہائی میں لکھنا شروع کیا۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اُردو فکشن میں ناول اور افسانہ اُن کی خاص پہچان ہے۔ ان کے اب تک چار ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''سمندر کا پانی'' (۱۹۸۶ء)، ''سائے'' (۱۹۹۰ء)، ''خوشی کا گیت'' (۱۹۹۴ء) اور ''خالی ہے جیبِ گل'' (۲۰۰۳ء) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوی مجموعہ (میں اور انجیر) اور ایک ناولٹ (دورنہ کرنا) بھی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی، سیاسی حالات اور معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ وہ ہماری روزمرہ کی سماجی زندگی اور معاشرتی ماحول کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں، خاص طور پر بیرونِ ملک مقیم

پاکستانیوں کی حالتِ زار کا بیان ان کا موضوعِ خاص ہے ،اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کافی عرصہ گلف کے مختلف ممالک میں قیام پذیر رہے۔فیاض ظفراپنے ناولوں میں یہ امر ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں کہ واقعات حقیقت سے قریب ہوں۔وہ انھی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا انھوں نے مشاہدہ کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔وہ کہانی کو بیان کرنے کے لیے کرداروں کا سہارا لیتے ہیں۔یہ کردار ہی ہوتے ہیں جو مصنف کے نقطۂ نظر کو قارئین تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں۔فیاض ظفر سماجی ماحول سے جنم لینے والے مختلف تاثرات اور کیفیات کی بھی بھرپور تصویر کشی کرتے ہیں۔انہوں نے فطرت کی رنگارنگی اور تنوع کو بہت قریب سے دیکھااور پھر اس صلاحیت اور تجربے کو اپنے ناولوں میں بھرپور طریقے سے استعمال بھی کیا ہے۔فیاض ظفر نے اپنے ناولوں میں جدید اسلوب اختیار کیا ہے۔وہ ناول کی ہیئت اور تکنیک سے پوری طرح واقف ہیں۔وہ اپنے ناولوں میں نہ تو تبلیغ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع سماجی مسائل ہیں۔انہوں نے جو بھی ناول لکھے وہ اپنے موضوعات، زبان، تکنیک اور اسلوب میں ہنر مندی کا ثبوت ملتا ہے۔ حسین مجروح لکھتے ہیں:

> فیاض ظفر ایک کہنہ مشق ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں، جن کا تخلیقی سفر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔اگرچہ ان کی فسوں کاری کے بہت سے مظاہر اشاعت کی تہمت سے سرفراز ہو چکے ہیں، تاہم عملی اور پیشہ وارانہ زندگی کا بیش تر حصہ دیارِ غیر میں بسر کرنے کے باعث، اُن کا نام اور کام اُس عمومی شناخت و مقبولیت کا سزاوار نہ ہو پایا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔"(۱)

ناول ''سمندر کا پانی'' ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کے اختتام سے لے کر ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک کے دورانیے کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کے پس منظر میں دوسری جنگِ عظیم کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ناول کی کہانی جاپان کے شہر ہیروشیما پر امریکہ کے ایٹم بم گرانے سے شروع ہوتی ہے۔اس شہر میں ہونے والی تباہی و بربادی کا نقشہ کچھ یوں کھینچا گیا ہے۔

> ''بم شہر پر گرایا، تو زمین پر زبردست لرزہ پیدا ہوا، زمین پر بسنے والے اور فضا میں اُڑنے والے ہر ذی روح کی نامانوس گھٹن سے سانسیں رکیں۔سُورج کی اندرونی حدت سے زیادہ گرم شعائیں ہر جاندار کی طرف لپکیں۔گوشت جلا ،ہڈیاں خاکستر ہوئیں اور عمارتیں بھسم ہو چکی تھیں ۔فصلیں زمین کی گہرائی تک تباہ ہو چکی تھیں۔"(۲)

جنگ کے اختتام پر فاتح ملک نے اس تباہی و بربادی پر جشن منایا۔انھیں اتنی جانیں ضائع ہونے پر ذرہ برابر بھی ملال نہ ہوا۔ناول کا مرکزی کردار اختر امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔جب وہ مشنری سکول میں پڑھ رہا ہوتا ہے تو

ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے خاندان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ حادثہ تب ہوتا ہے جب وہ اختر سے ملنے آ رہے ہوتے ہیں۔ اس سانحہ کا اختر نے بہت گہرا اثر لیا اور وہ اس کی وجہ سے بہت خاموش رہنے لگا۔ اختر ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں لیڈی مینٹس اس کا خیال رکھتی تھیں، لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں لیڈی مینٹس واپس چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد وہ مزید تنہائی کا شکار ہو گیا۔ وہ مشنری سکول سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ سول سروس کا امتحان پاس کر کے بڑا سرکاری افسر بن جاتا ہے۔ بیورو کریسی کی ملازمت میں اس کے ساتھی اس کے نظریات اور مزاج کی وجہ سے پسند نہیں کرتے اور اس سے نفرت کرتے۔ کیونکہ اختر کا نقطۂ نظر اور مزاج ان سے کافی مختلف تھا۔ وہ اپنی عملی زندگی میں معاشرتی اور سیاسی نظام کا بُری طرح شکار ہو کر بھی اس کا حصہ نہیں بنتا۔ اس لیے اختر کا تبادلہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی اور سماجی سسٹم کی خرابی کے باعث اختر مایوس اور ناکام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن سے آخر تک تنہائی کا شکار رہا۔ ناول کے دوسرے حصہ میں وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی زندگی ملکی شکست وریخت کی طرح ان دیکھی قوتوں کا شکار ہو کر سوکھے پتوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے گزر جاتی ہے اور آخر کار وہ اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

> ''یہ ناول ایک ریڈیائی پیغام کی طرح انسان کے داخل میں تھرتھراہٹ پیدا کرتا ہے اور سوچنے پر مائل کرتا ہے۔ وہ واقعات و حادثاتِ زمانہ اور افکار و تصورات کے ہجوم کو حیرت سے دیکھتا ہے (۳)''۔

ناول ''سمندر کا پانی'' میں تاریخ کو مرحلہ وار بیک گراونڈ اور مناظرِ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا دوسرا اہم کردار روبی ہے۔ بیورو کریسی کی میٹنگ میں اختر کی ملاقات روبی سے ہوئی اور اُسے روبی سے محبت ہو جاتی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ اختر کے نفسیاتی مسائل کی وجہ سے اُسے چھوڑ دیتی ہے۔ محبت کی ناکامی کی وجہ سے اختر اپنے فرائض منصبی کو اچھی طرح سے نبھا نہیں پاتا۔ حالات کی ستم ظریفی کہ لیگی لوگوں کو اختر کے خلاف ثبوت ملتے ہیں تو وہ اس کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اختر ملازمت کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے، جہاں بھکارن رانو اسے علاج کے طور پر افیون دیتی ہے اور اسے نشہ کا عادی بنا کر فقیر بنا دیتی ہے۔ ایک دن روبی جب اپنی بیٹی کو لینے آ رہی ہوتی ہے تو اختر کو فقیر کے روپ میں دیکھ کر اسے دکھ ہوتا ہے۔ بھیک مانگتے ہوئے اسکی طبعیت ناساز ہو جاتی ہے، کوٹھی کا مالک اس کا علاج کرواتا ہے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے ، لیکن مالک نے جب کچھ سوال پوچھے ، تو اختر ڈر کی وجہ سے فرار ہو جاتا ہے۔ ناول کے آخر میں اختر یہاں سے نکل کر ایک ویران جنگل کی طرف رُخ کرتا ہے۔ جہاں وہ ایک قصبے میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں لوگ توہم پرستی کا شکار ہوتے ہیں اور

کسی بلا کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن جس دن انھوں نے اختر کو اس گاؤں میں دیکھا، اس دن اُن کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ جنگل کے آس پاس کے لوگ اسے سائیں بابا سمجھتے، تو کچھ جن سرکار مانتے تھے۔ اختر جب پہاڑ پر چڑھ گیا، تو وہاں لوگوں نے دیکھا کہ سائیں سرکار موجود نہیں انہوں نے اُسے تلاش کیا تو اختر گرا ہوا دیکھا، جب پاس گئے تو ایک شخص کی آواز آئی کہ جن سرکار اب نہیں رہے۔ وہ ایک پُراسرار شخص جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا، جس کمرے میں وہ چند روز رہا، وہاں کچی زمین پر اُس نے کچھ یہ الفاظ لکھے تھے:

''آؤ ہم اس جہاں سے اُٹھ جائیں، اور زمین بہت تنگ ہو چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ زمین کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے اور ہمارے ہم نفس کچھ کھلے ہو کر بیٹھ جائیں۔ ان عمارتوں کی مزید ضرورت نہ پڑے، جو کھیتوں، سبزہ زاروں اور باغوں کی قبریں بن جاتی ہیں۔''(۴)

اور یوں اختر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کی موت کے پس پردہ وجود کی تنہائی، شناخت کا مسئلہ، گھر والوں کی موت، سماجی بے رہ روی، محبت میں ناکامی جیسی وجوہات ہیں۔ ناول میں سیاست، مذہب، فطرت، معاشرت، غم اور مایوسی کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے مطابق:

''فیاض ظفر کے دونوں ناول (سائے، سمندر کا پانی) ہماری معاشرتی زندگی کا حصہ بھی ہیں اور بین الاقوامی مسائل اور عمرانی موضوعات سے عبارت بھی۔ اُن کے اسلوب کی خوبی انہیں عمومی ناول کے سطح سے ممتاز بھی کرتی ہے اور منفرد بھی۔''(۵)

فیاض ظفر نے ناول میں حسین مناظرِ فطرت کو بھی بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے اور قاری کو فطرت کی خوبصورتی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس ناول میں مختلف مذاہب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اسلام اور کرائسٹ کے علاوہ کنفیوشس، مہاویر، بدھ مت اور زرتشت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مذہب کے حوالے سے لیڈی مینٹس کی اپروچ مثبت نظر آتی ہے۔

''مذاہب بہت افضل ہیں اور اُن سے افضل ہے انسان، جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ انسانوں کا دل دکھانا، اور ان پر ظلم کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔''(۶)

ناول میں مصنف نے حزن و ملال کی کیفیات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ غم کے حوالے سے آفاقی نوعیت کا بیان قابل ذکر ہے۔ اختر کے ذریعے غم کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''غم جب آنسو بن کر نکلنا چاہے اور نہ نکلے تو ختم نہیں ہوتا بلکہ محفوظ ہو جاتا ہے، اور پھر پانی کی شکل میں نہیں بہتا بلکہ کبھی کبھی دھوپ پڑنے سے بھاپ کی مانند پھیل جاتا ہے اس دھوئیں کو

نکلنے کے لیے کسی مخصوص راستے کی ضرورت نہیں پڑتی، بس عیاں ہو جاتا ہے۔ یا جانے والوں کی یاد جو وقت اور فاصلوں میں دراڑیں ڈالتی ،اس کی درزوں سے ہوتی اپنے پیاروں کو ان زنجیروں میں جکڑے رکھتی ہے۔''(۷)

ناول میں سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو وحدتوں کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ ناول میں گداگری کی خرافات کو اجاگر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک مافیا کے طور پر کام کرتے ہوئے اپنا نیٹ ورک قائم کر لیتے ہیں۔ وہ عوام کی محدود دنیاوی خواہشوں اور اس طبقے کے مخصوص مسائل سے خوب آگاہ ہوتے ہیں۔ کراچی میں گداگری کی حالتِ زاریوں بیان کی گئی ہے:

''کراچی کے سینماؤں ، باغوں اور سمندر کے کنارے آنے والے غیر قانونی جوڑوں کو ان کا اصل تعلق جانتے ہوئے دعادے کر پیسے بٹورنا، کراچی کے گداگروں کو خوب آتا تھا۔''(۸)

لاہور کے گداگر کراچی والے فقیروں پر رشک کرتے اور ان کے مکینیکل نظام کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہیں، وہ انسانی اعضاء کو حسبِ ضرورت قابل استعمال رکھتے ہوئے، لیکن دیکھنے میں انتہائی قابل رحم جسمانی ساخت بنا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس لاہور کے گداگر میلوں اور عیدوں سے اپنی کمائی کرتے ہیں:

''درباروں پر آنے والی عورتوں سے خوب پیسے بٹورتے تھے ،کہ وہ ان کی محدود دنیاوی خواہشوں اور اس طبقے کے مخصوص مسائل سے آگاہ تھے۔''(۹)

اس ناول میں جہاں مایوس کن صورت حال کی عکاسی ملتی ہے، وہاں ان حالات سے بچنے کے لیے رجائی تصور بھی ملتا ہے۔

فیاض ظفر کا ناول ''سمندر کا پانی'' میں وجودی فکر کا بھی احساس ملتا ہے۔ وجودیت کی اساس یہ ہے کہ انسا ن دنیا میں آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن معاشرتی دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے لیے ایک مختلف طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس ناول کے مرکزی کردار اختر کا بھی ہے۔

''جس روز تم محض ایک دستخط کے سہارے کسی کی ملکیت بن گئی تو مجھے پہلی بار اپنے وجود کے کھوکھلے پن اور اس احساس کی شدت کا پتہ چلا۔ مجھے اپنے پپوٹے بند باندھے پانی پر تیرتے محسوس ہو رہے تھے۔۔۔ میرا وجود کس قدر بے معنی تھا میرا ہر قدم زمین پر کسی لاتعلقی سے پڑ رہا تھا اور میرے قدموں کو زمین کا لمس کتنا اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔''(۱۰)

اس ناول کا پلاٹ مضبوط ہے۔ کہانی کا آغاز سے لے کر اختتام تک ایک تسلسل قائم ہے، جو اختر کی زندگی سے شروع ہو کر اس کی موت تک اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کے احساسات، جذبات، خیالات، خواہشات اور نفسیات کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ مکالموں سے پلاٹ کے ارتقاء میں مدد ملتی ہے۔ اس ناول کے مکالمے کرداروں کے ماحول اور مزاج کے عین مطابق ہیں۔ ان کی گفتگو فطری اور حقیقت سے قریب ترین ہے۔ اس ناول میں اُردو، پنجابی اور انگریزی زبان کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سادگی اور پُرکاری ہے۔ اسلوب میں سادگی مصنف کے اندازِ بیان کی خاص خوبی کا پتا دیتی ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی کہتے ہیں:

> ''اس ناول کے ابتدائی اور آخری حصے کا اسلوب جدید اور جاندار ہے جبکہ درمیانے حصے کی تکنیک کو بانو قدسیہ اور جمیلہ ہاشمی سے ملایا جا سکتا ہے۔''(۱۱)

ناول کے کردار اپنے تمام تر نفسیات و جذبات، عادات و اطوار، خاندانی پس منظر اور موجودہ حیثیت و عمر کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں میں اختر، زاہد، شاہد، روبی، سلمیٰ، شاہ جی، لیڈی میٹنس، رابعہ، مسز خان، رضا، احسن، احمد، رشیدہ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ناول میں کرداروں کے جذبات و احساسات کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دیگر کرداروں میں مسز خان اور رانو جیسے کردار جو کہ اپنی تسکین کے لیے لوگوں کا استعمال کرتی ہیں۔ فیاض ظفر کے یہ کردار ہماری معاشرتی زندگی کے ترجمان ہیں۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری میں ان کی آرٹسٹک اپروچ بھی نظر آتی ہے۔ اختر کا گھر مغلیہ طرز کا بنا ہونا اور اس میں موجود چیزیں سلیقے سے سجی نظر آتی ہیں۔

فیاض ظفر کا تعلق چونکہ لاہور سے ہے۔ اس لیے ناول میں لاہور کے علاقوں اور ماحول کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ناول میں لاہور کے مقامات جن میں لارنس گارڈن اور انارکلی وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔ ان مقامات کے ماحول اور ان کی جزئیات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

> ''گھنے سبزے میں گھری ایک مصنوعی پہاڑی پر، جو لارنس گارڈن لاہور کی زینت ہے، مارچ کی دوپہر زمین سے ٹکرا کر لوٹتی ہے، تو گداز اور نرم مہک بن جاتی ہے۔ اور پھر ایسے میں جب سفید، سُرخ، نارنجی، سیاہ، نیلے اور کاسنی پھول کھلے ہوں، تو مست تتلیاں بھی پیچھے بھاگنے والے بچوں سے زیادہ فاصلہ رکھ کر اپنی جان نہیں بچاتیں، وہ اکثر اپنے پروں کے رنگ گنوا بیٹھتی ہیں۔''(۱۲)

ناول میں فطرت کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ پہاڑوں کا منظر، پھولوں کی خوبصورتی اور ان کی خوشبو جو کسی بھی انسان کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے، سورج نکلنے اور غروب ہونے کا منظر، رات کی چاندنی غرض یہ کہ فطرت کا ہر منظر ہمارے سامنے عیاں ہوتا ہے۔ مثلاً صبح کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

> ''ابھی صبح نے اپنی آنکھ پوری طرح سے نہیں کھولی ہے۔ افق سورج کی سرخی کے تاثر سے پاک ہے۔ زمین کے بدن سے فصلوں کی خوشبو میں رچی ہوئی مہک پھوٹ پھوٹ کر فضا میں بکھر رہی ہے۔ جہاں پرندے گھونسلوں سے نکل کر چہلیں کر رہے ہیں، شاخوں میں بنے ہوئے اپنے گھونسلوں، فضا اور فصلوں اور زمین کے درمیان مختصر مختصر وقفوں کے بعد ان کی اڑان مسلسل جاری ہے، کھیت دھلے ہوئے سبزے سے سجے ہوئے ہیں اور کچھ پر سرسوں کے پیلے رنگ کے پھولوں کی تہہ چڑھی ہوئی ہے، بادِ نسیم کے خنک جھونکے، سرسوں کی نازک شاخیں، سرسبز پتوں اور ریشمی پھولوں میں یوں پیوست ہو رہے ہیں جیسے کسی خوبرو کی نظریں۔۔۔'' (۱۳)

اسی طرح رات کی تصویر کشی خوبصورت انداز میں کی ہے، جس سے قاری اپنے گرد و پیش میں بہار کی حسین فضا، مہک، اور چاند ستاروں کی کہکشاں کو محسوس کر سکتا ہے۔

> ''یہ بہار کی ایک رات ہے۔ تر و تازہ ہوا جسم کے ایک ایک خلیے کو چھو چھو کر، چوم چوم کر اور منا منا کر زندگی کا احساس دے رہی ہے، آسمان صاف ہے، ستارے جگمگا رہے ہیں اور چاند کی چاندنی گاؤں کے کچے مکانوں کو اور اور اس کے مکینوں کو چھتوں پر، صحنوں میں، گلیوں میں اور میدانوں اور کھڑکیوں کے ذریعے کمرے میں گھس گھس کر تھپک رہی ہے۔'' (۱۴)

ناول میں واقعات کے بیان میں مناظرِ فطرت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ مصنف نے عمدہ طریقے سے کائنات اور فطرت کی منظر نگاری کی ہے کہ انسان کے دکھوں کو کم کر کے اُسے خوشی مہیا کرتی ہے۔ بارش کے بعد کے مناظر کی تصویر کشی کچھ یوں کی گئی ہے:

> ''سارے بادل زمین پر آ گئے ہیں، کچھ پانی بن گئے اور کچھ برف، چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ زندگی رواں دواں ہے۔ زمین بھر گئی ہے۔ سبزے میدانوں اور پہاڑوں سے سج گئے ہیں۔ پہاڑوں کی برف نے دنیا کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔'' (۱۵)

فیاض ظفر نے ناول میں کہانی کو بیان کرتے وقت عام روش سے ہٹ کر مختلف تکنیک استعمال کی ہے، جس میں تاریخ نگاری کا سہارا لیتے ہوئے ناول کے واقعات کو آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے واقعاتی ترتیب کو تاریخ کے لحاظ سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کائنات کے حسن اور فطرت کے مناظر کو کمال مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے کہانی کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیلانی کامران رقمطراز ہیں:

''فیاض ظفر کے ناول ''سمندر کا پانی'' میں کہانی کے علاوہ بعض نئے اجزاء بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف تاریخ کو مرحلہ وار بیک گراونڈ اور مناظرِ فطرت کو ایک نئی جہت کے طور پر کہانی کے خدوخال میں شامل کرتا ہے۔''(۱۶)

اس ناول کی کہانی میں ہمیں ہر جگہ کوئی نہ کوئی نیا واقعہ یا حادثہ ضرور نظر آتا ہے۔ جو قاری کو سوچنے، سمجھنے اور کوئی مثبت عمل کرنے پر مجبور ضرور کرتا ہے۔ ناول میں گاؤں والوں کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کو بیان کیا گیا ہے۔ شاہ جی جو آسیب زدہ لوگوں کے علاج کے حوالے سے مشہور ہیں، شاہد اس کے ڈھونگ اور مکروہ چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انھیں بتاتا ہے کہ شاہ جی نے کاغذ پر پوٹاشیم میگنیٹ کی مدد سے دیگچی کے پانی کا رنگ لال کرتے ہیں لیکن گاؤں والے اس کی بات نہیں مانتے اور اسے نکال دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کہانی میں موجود واقعات سے انسان نظام کائنات کے تصورات کو بھی محسوس کرتا ہے۔ اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں یہ ناول جدید تکنیک اور اسلوب کی وجہ سے اہم اضافہ ہے۔

فیاض ظفر کا ناول ''سمندر کا پانی'' میں نئی جہت اور اظہار کے نئے زاویوں کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے بیانیہ اسلوب کے ذریعے اپنی بات قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ادبی حلقوں میں بھی ان کے ناولوں کو سراہا جارہا ہے۔ بلاشبہ افسانوی ادب میں انہیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ناول سے چند اقتباسات:

''گداگری کا حکومت کی مشینری سے اتنا ہی تعلق ہے، جتنا کسی صاف ستھرے انسان کا اپنے جسم کی قابل منسوخ جزویات سے ہوتا ہے۔''(۱۷)

''جہاں مکمل انتشار ہو وہاں تہذیبوں کو زندہ رہنے یا پروان چڑھنے کا موقع ہی کب ملتا ہے۔''
(۱۸)

فیاض ظفر کے لفظوں میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر کی خاص خوبی فطری اندازِ بیان ہے۔ ناول میں سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ معاشرے کے حالات و واقعات کا باریک بینی سے مشاہدہ ہی نہیں کرتے بلکہ وہ ان مسائل کے حل بھی تجویز کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوعات میں جدید اسلوب کا سہارا لیکر اپنے خیالات و

نظریات کو قاری تک پہنچایا۔اس لیے ادبی حلقے میں ان کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ناول میں جنگوں کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ یہ حکمرانوں کے اشاروں پر شروع اور ختم ہوتی ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں ملک میں انتشار کی وجہ سے ترقی کا سفر رک گیا۔بنگال میں سمندری طوفان سے چٹاگانگ کو بہت نقصان ہوا لیکن کسی نے ان کی مدد نہ کی۔اس ناول میں حکمرانوں کے مکروہ چہروں کے ساتھ ایلیٹ کلاس کے عیش و عشرت اور مادی ضروریات کے تحت وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔اس کہانی میں بیوروکریسی کی چالوں، سقوطِ ڈھاکہ، گداگری کی خرافات اور توہم پرستی کو خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔یہاں تخلیقی حِس انھیں قصہ طرازی پر اُکساتی نظر آتی ہے اور جنوں کا استعارہ بن کر سماجی مسائل کے تانے بانے کو ترتیب دیتے ہیں۔وہ رومانوی اسلوبِ بیان سے جذبے، خیال، تخیل اور منطقی استدلال سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔یہ ناول موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اہم ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

> ''فیاض ظفر نے اپنے ذہن کے انتعاش الاشعہ کے اثر سے نمودار ہونے والے فکر و خیال کے رنگین ستاروں سے ادب کی تاریخ میں نئی مواداتی اور لسانی رنگینیاں بکھیر دی ہیں۔''سمندر کا پانی''اُردو ناول کا کوکبِ قطبیہ ہے۔''(۱۹)

فیاض ظفر کا پہلا ناول ''سمندر کا پانی'' میں سیاست، مذہب، فطرت اور سماج جیسے موضوعات کو اجاگر کیا ہے۔ناول میں ہیروشیما پر ہونے والے ایٹمی حملے کی تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ سانحہ مشرقی پاکستان اور ملکی سیاسی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ معاشرے کے دیگر مسائل میں سماجی ابتری جس میں توہم پرستی اور گداگری کی لعنت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں مصنف نے جدید اسلوب کے ذریعے اپنے خیالات کو بیان کیا۔اس ناول کی زبان سادہ اور سہل ہے۔ کہانی کے کرداروں کی بات کی جائے تو اختر کا کردار ہمارا معاشرتی المیہ ہے۔ناول میں وجودی فکر کا احساس بھی غالب دکھائی دیتا ہے۔اس ناول میں واقعات کا تسلسل مناسب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ناول میں کہانی کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے تشکیل دیا گیا ہے۔اختر کی فیملی کی وفات کی وجہ سے اس کا تنہا اور سنجیدہ ہونا، روبی سے بچھڑنا، موت کا خوف، موت سے بچنے کے لئے فقیر کا روپ دھارنا، ایک سائیں کی حیثیت سے اسکی پہچان اور پھر موت کے منظر کو مختلف واقعات سے مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ناول میں شروع سے آخر تک تجسّس قائم رہتا ہے اور ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ناول میں خدا کے وجود اور اسلامی تصورِ فلسفہ کو بھی پیش کیا گیا ہے۔الغرض فیاض ظفر نے ناول میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے ہیں بلکہ اپنے منفرد اسلوب کی مدد سے دوسروں سے الگ اور ایک نئی راہ نکالنے کی سعی بھی کی ہے۔ مصنف نے اس ناول میں تاریخ کو مرحلہ وار بیک گراؤنڈ اور مناظرِ

فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ انھوں نے واقعات کو چابکدستی سے ایک لڑی میں پرو کر کہانی تشکیل دی ہے۔ زبان اور فن کی سطح پر یہ ناول عصری تقاضوں پر پورا اُترتا ہے اور موضوع اور اسلوب کے حوالے سے اہم تجربہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حسنین مجروح، فلیپ، میں اور انجیر (افسانے)، از فیاض ظفر کرئی ایٹو بکس، لاہور، ۲۰۲۰ء

۲۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی، ظفر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۸

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، فلیپ، ''خالی ہے جیبِ گل''، از فیاض ظفر، کرسٹل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۴۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی، ص ۲۳۷

۵۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، فلیپ، خوشی کا گیت، از فیاض ظفر، افراء پرنٹنگ پریس، لاہور، س۔ن

۶۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی،، ص ۱۴

۷۔ ایضاً، ص ۷۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۹۔ ایضاً

۱۰۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی، ص ۱۲۷

۱۱۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، سمندر کا پانی، فلیپ، ظفر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۱۳۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی،، ص ۳۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۵

۱۶۔ جیلانی کامران، پروفیسر، سمندر کا پانی، (فلیپ)

۱۷۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، فلیپ، دورنہ کرنا (ناولٹ) از فیاض ظفر، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۰ء

۱۸۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی، ظفر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۵

۱۹۔ فیاض ظفر، سمندر کا پانی،، ص ۱۴۳